

## تبدیلی کی سمت اور منزل۔ مدینہ کی اسلامی فلاحی ریاست

پروفیسر خورشید احمد

تبدیلی قدرت کا قانون ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ترقی اور تشکیل نو کا عمل اُمید اور تبدیلی کی جدوجہد ہی سے عبارت ہے، لیکن تبدیلی برائے تبدیلی سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تبدیلی خیر اور صلاح کا باعث صرف اس وقت ہوتی ہے جب اس کی سمت اور منزل کا صحیح صحیح تعین کیا جائے اور بروقت ساری توجہ اصل مقصد کے حصول پر مرکوز کی جائے۔ اگر یہ نہ ہو تو صرف چہرے بدلنے سے حالات میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی کا عمل ترقی کے بجائے تنزل اور مزید بگاڑ پر منتج ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ پچھلے چند برسوں میں پاکستان اور امریکا دونوں میں ہوا ہے۔ قوم مشرف کے آمرانہ اور نظریاتی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے تباہ کن دور سے نجات چاہتی تھی، اور فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں اس نے مشرف اور اس کے ساتھیوں کو اٹھا پھینکا اور تبدیلی کی اُمید دلانے والوں کو منصب اقتدار سے نوازا لیکن ”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“۔ پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کی حکومت نے پرویز مشرف ہی کی پالیسیوں کو مزید بگاڑ کے ساتھ جاری رکھا۔ امریکا کی غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ معیشت کی چولیس ہلا دیں اور اپنے چار سالہ دورِ حکمرانی میں پاکستان کو بیک وقت تین تباہ کن بحرانوں کی دلدل میں دھکیل دیا: ۱۔ خراب حکمرانی ۲۔ نااہلیت ۳۔ بدعنوانی (کرپشن)۔

قوم آج پھر تبدیلی کی بات کر رہی ہے اور سیاسی فضا میں ہر سمت سے اس کا شور بلند ہو رہا

ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں ٹھہر کر اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ تبدیلی، ایک اور دھوکا اور سراب نہ بن جائے، اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ٹھیک ٹھیک اس امر کا تعین کر لیا جائے کہ کون سی تبدیلی مطلوب ہے۔ اس کی سمت، منزل مقصود اور نقشہ کار طے کرنا اولین ضرورت ہے۔ دوسری تازہ مثال خود امریکا کی ہے۔ اوباما صاحب تبدیلی کے نعرے پر برسرِ اقتدار آئے تھے اور امریکا کے تمام ہی راے عامہ کے جائزے یہ خبر دے رہے تھے کہ امریکی عوام بش کے دور کی پالیسیوں سے نالاں ہیں اور سیاسی زندگی میں ایک نیا ورق پلٹنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن پہلے ہی سال میں ان کے سارے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود، یہ بات واضح ہو گئی کہ اوباما صاحب بھی اسی طرح امریکی مقتدرہ (establishment) اور مقتدر اداروں اور مخصوص مقاصد پیش نظر رکھنے والے گروہوں کے اسیر ہیں جس طرح بش تھا۔ چنانچہ اس کے اقتدار کے تین سال، کسی تبدیلی کے نہیں بلکہ تسلسل اور بگاڑ میں اضافے اور ملکی اور بین الاقوامی دونوں محاذوں پر امریکا کی ناکامی کے سال ثابت ہوئے ہیں۔

ان دونوں مثالوں کی روشنی میں اس امر کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے کہ پاکستان کے عوام ۲۰۱۲ء میں اپنے مستقبل کے لیے جس تبدیلی کے لیے سرگرم عمل ہیں، اس کے خدوخال اس جدوجہد کے آغاز ہی میں بالکل واضح ہونے چاہئیں، اور قوم سیاسی قیادت کو اس کسوٹی پر پرکھے جس سے معلوم ہو سکے کہ مطلوبہ تبدیلی کے لیے کس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور وہ کون سے کھوٹے سکتے ہیں جن سے نجات مطلوب و مقصود ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان نے اس سلسلے میں اپنا نہایت واضح اور مفصل منشور سال کے آغاز ہی میں قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے اور اس میں تبدیلی کے لیے جس نمونے کا تعین کیا ہے وہ مدینہ کی اسلامی فلاحی ریاست ہے جس کی صورت گری خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوئی اور جس نے تاریخ انسانی کے رخ کو موڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے کے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی دلی خواہش ہے کہ ان کا اجتماعی نظام خلافت راشدہ کے نمونے پر قائم ہو۔ وہ خلفائے اربعہ کے دور کو تاریخ انسانی کا مثالی دور سمجھتے ہیں اور ماضی میں بھی برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس نمونے کو رنگ و بو کی دنیا

میں دوبارہ زندہ و قائم کریں۔ اُمتِ مسلمہ کے قلب و نظر کو کبھی کسی ایسی تحریک نے ایبل نہیں کیا، جو خلافتِ راشدہ کے مقابلے میں کوئی دوسرا معیار اور نمونہ پیش کرے۔ دوست اور دشمن سب اس بات کے معترف ہیں کہ اسلام کا وہ مثالی دور ہی ہمیشہ مسلمانوں کی توجہ کا مرکز اور ان کا حقیقی مطلوب و مقصود رہا ہے اور اس کے احیا کے لیے مسلمان ہر زمانے اور ہر ملک میں جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کی پکار ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ع

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہ اعلان مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کا پیامبر ہے اور ان کے حقیقی جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے۔ مسلمان دل سے چاہتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے دور کا احیا ہو اور ان کی یہ خواہش اس لیے ہے کہ وہ دور انسانی تاریخ کا بہترین دور تھا۔ نیز خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کو آنے والوں کے لیے معیاری دور قرار دیا ہے اور اس کے اتباع کی دعوت دی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: ”پس تمہارا فرض ہے کہ میری سنت کو اختیار کرو اور اس پر مضبوطی سے جمے رہو اور اس کو دانتوں سے پکڑ لو..... خبردار! ان باتوں کے قریب نہ پھٹکنا جو میرے طریقے اور خلفائے راشدین کے طریقے سے ہٹ کر نئی ایجاد کر لی جائیں۔“

حضور کا یہی ارشاد ہے جس کی تعمیل میں مسلمان ہمیشہ احیاءِ خلافتِ راشدہ کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور آج بھی ملتِ اسلامیہ کے سامنے یہی نصب العین ہے لیکن خلافتِ راشدہ کے احیا کے معنی کسی خاص دورِ تاریخ کو، اپنے تمام جزوی مظاہر اور تکنیک کے ساتھ دوبارہ زندہ کرنا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کے جو اصول، اقدار اور ضابطے اس زمانے میں اختیار کیے گئے، انہی کو از سر نو قائم کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ اصولِ ابدی صداقت رکھتے ہیں اور ہر دور اور ہر زمانے میں معاشرے کی قلبِ ماہیت اسی طریقے پر کر سکتے ہیں جس پر اس سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ کے زمانے میں کر چکے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے قیام کے معنی انہی اصولوں کا قیام ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ اصول کون سے ہیں؟ خلافتِ راشدہ کے قیام کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس دورِ تاریخ کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس لیے کہ اگر ہم خلافتِ راشدہ کا احیا چاہتے ہیں تو ہمیں

انہی اصولوں، انہی بنیادوں اور انہی اجتماعی خصوصیات کا احیا کرنا ہوگا۔

### دستوری حکومت

خلافتِ راشدہ کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس کا نظام حکومت شخصی نہیں، دستوری تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کے تمام معلوم سیاسی نظام بادشاہی کی بنیاد پر قائم تھے یا شخصی آمریت کی۔ آپ نے جو نظام حکومت قائم کیا وہ شخصی بنیاد کے بجائے قانون کی بالادستی اور ایک معین دستور کی حکومت کی اساس پر تھا۔ اس میں نہ شہنشاہیت کی گنجائش تھی اور نہ آمریت کی، نہ خاندان پرستی تھی اور نہ شخصیت پرستی کی۔ حاکمیت کے اصل اختیارات اللہ تعالیٰ کو حاصل تھے اور اس کا عطا کردہ، قانون مملکت کا قانون تھا۔ امیر اور غریب اور اپنے اور پرانے سب اس قانون کے تابع تھے اور کوئی اس سے سرمو انحراف نہ کر سکتا تھا۔ یہی چیز ہے جس کا اظہار حضرت ابو بکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا ہے: ”لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ تم لوگوں میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں فلاح و بہبود کے کام کروں تو میری امداد کرنا ورنہ اصلاح کر دینا۔ میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرنا لیکن خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔“

پھر حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو روانہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: ”میرا مقام صرف قبیح کا ہے، میں بہر حال کوئی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ پس اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر استوار ہوں تو میری پیروی کرنا اور اگر اس راہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے راہِ راست پر لے آنا۔“

یہاں دستوری حکومت کا نقشہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امیر جو کچھ چاہے وہ کرنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔ وہ خود ایک قانون کا پابند ہے اور اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ اس قانون کو نافذ کرے۔ یہی قانون خود اس کے اوپر بھی قائم ہوتا ہے اور یہی تمام مسلمانوں پر بھی۔ وہ لوگوں پر اپنی مرضی تھوپنے کا حق دار نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے: ”ایک حاکم کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ لوگوں کے اندر جو چیز دیکھنی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو حقوق و فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو وہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارا فرض صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جس اطاعت کا حکم دیا ہے اس کا حکم دیں، اور جس نافرمانی سے روکا ہے اس سے روکیں۔“

امیر اپنی ذات میں مطاع نہیں ہوتا۔ اس کی اطاعت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ شریعت کو قائم کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے کہ اطاعت صرف معروف میں ہے منکر میں نہیں، اور یہ اصول شخصی حکومت کی جزا کاٹ دیتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ  
(المائدہ ۱:۵) معاونت کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں اور تعاون نہ کرو گناہ اور برائی کے کاموں میں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اسلامی حکومت کے اصحاب امر کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ اور جب خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

پھر امیر اس قانون کو صرف اوروں ہی پر نافذ نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بھی نافذ کرتا ہے اور خود بھی اس کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جس طرح کہ دوسروں سے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس بات کو اس طرح بیان فرمایا ہے: ”میں ایک عام مسلمان اور ایک کمزور بندہ ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کا مجھے بھروسا ہے۔ میں جس منصب پر مقرر کیا گیا ہوں ان شاء اللہ وہ میری طبیعت میں ذرہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں کر سکے گا۔ بزرگی اور بڑائی جتنی بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بندوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ عمر خلیفہ بن کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں اپنی ذات سے بھی حق وصول کروں گا اور جس معاملے میں ضرورت ہوگی خود بڑھ کر صفائی پیش کروں گا۔ میں تمہارے اندر کا ایک آدمی ہوں، تمہاری بہبود مجھے عزیز ہے، تمہاری خفگی مجھ پر گراں ہے اور جو امانت میرے سپرد کی گئی ہے مجھے اس کی جواب دہی کرنی ہے۔“

خلافت راشدہ کی یہی دستوری نوعیت ہے جس کی وجہ سے امیر کو بیت المال پر بے قید تصرف کا اختیار نہیں۔ وہ اس کو استعمال کرنے کا تو مجاز ہے مگر اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق نہیں

بلکہ شریعت کے احکام کے مطابق۔ خلافتِ راشدہ میں نہ امیر خود اپنے اُوپر بیت المال کی رقم کو بے مجاہد خرچ کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کے اُوپر۔ اس اصول کو حضرت عمرؓ نے اس طرح بیان کیا ہے: ”میں نے اپنے لیے اللہ کے اس مال کو یتیم کے مال کے درجے پر رکھا ہے۔ اگر میں اس سے مستغنی ہوں گا تو اس کے لینے سے احتراز کروں گا اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق اس سے اپنی ضرورتیں پوری کروں گا۔“

یہی حال حضرت علیؓ کا تھا جو بیت المال سے بے جا طور پر نہ خود ایک پیسہ لیتے تھے اور نہ کسی دوست اور رشتہ دار کو دیتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے یہ گوارا کر لیا کہ بہت سے لوگ خواہ ان سے کٹ کر دمشق کے اصحابِ اقتدار سے جا ملیں لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ کسی کو ایک پائی بھی بغیر حق دے دیں۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں اگر کوئی شخص بیت المال کی کوئی رقم غلط خرچ کرتا تھا تو اس پر سخت کارروائی کی جاتی تھی اور حضرت عمرؓ نے تو حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے جرنیل تک کو ۱۰ ہزار درہم غلط طور پر استعمال کرنے کے جرم میں معزول کر دیا تھا۔

یہ ساری بحث ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کی پہلی بنیاد یہ تھی کہ حکومت شخصی نہیں دستوری ہے، اور دستورِ عمل کی حیثیت خدا کی نازل کردہ شریعت کو حاصل ہے جس کی اطاعت امیر و مامور سب کو کرنی ہے اور جس کی اطاعت سے انحراف کے بعد کوئی طاقت باقی نہیں رہتی ہے۔ اس اصول نے آمریت کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، اور قانون کی حکمرانی کے اس دور کا آغاز کیا جس کا اصول یہ تھا کہ ”خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو اس کا بھی ہاتھ قلم کر دیا جائے گا۔“

### شورائی اور جمہوری نظام

خلافتِ راشدہ کی دوسری بنیاد یہ تھی کہ اس کا پورا نظام شورائی اور جمہوری تھا۔ اسلام میں شورائی کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ خود نبی اکرمؐ سے فرماتا ہے:

وَسَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (ال عمران ۱۵۹:۳) اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ اور ملت کے نظامِ اجتماعی کے متعلق قرآن کی واضح ہدایت یہ ہے کہ: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشورى ۳۲:۳۸) ان کے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کا نظام اسی نصِ قرآنی کی اساس پر قائم تھا اور حکومت کے ہر شعبے میں مشاورت کی اسپرٹ کا فراموشی:

(۱) خلیفہ کا انتخاب باہم مشورے سے ہوتا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کو ثقیفہ بنو ساعدہ میں باہم مشاورت کے بعد منتخب کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی تجویز پر تمام مسلمانوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو برضا و رغبت اپنا خلیفہ چنا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمرؓ کو نامزد کرنے سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا اور حضرت عمرؓ نے بیعتِ عام کے بعد اپنے منصب کو سنبھالا۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب میں بھی مدینہ کے ایک ایک فرد سے مشورہ کیا گیا اور مسلمانوں کی رائے سے آپ خلیفہ منتخب ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کی تجویز دی گئی تو حضرت علیؓ نے صاف کہا: میری بیعت خفیہ طریقے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہو سکتی ہے۔ آپ نے اسی موقع پر اسلام کے نظامِ انتخاب کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

”تمہیں ایسا کرنے کا (یعنی کسی کو خلیفہ بنانے) کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے، وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔“

اس طرح خلافتِ راشدہ کے دور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خلافت ایک انتخابی منصب تھا اور مسلمان اپنی آزاد مرضی سے اپنے میں سے بہترین شخص کو اس کام کے لیے منتخب کرتے تھے۔ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اوپر سے اُمت پر مسلط ہو جائے۔ جب مسلمانوں میں قیصر و کسریٰ کے اس مکروہ طریقے کا آغاز ہو گیا تو خلافتِ راشدہ ختم ہو گئی اور ملکیت کا دور شروع ہو گیا!

ب۔ خلافتِ راشدہ میں عمال اور گورنرز بھی متعلقہ صوبوں کے لوگوں کے مشوروں سے مقرر کیے جاتے تھے اور اگر کسی مقام کے لوگ کسی شخص کو ناپسند کرتے تھے تو اسے تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

ج۔ حکومت کے سارے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے تھے۔ امیر تمام اہم معاملات میں پالیسی بنانے سے پہلے اربابِ حل و عقد سے مشورہ کرتا تھا اور ان کے مشورے سے جو پالیسی طے ہوتی تھی اسے نافذ کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے دوا دارے تھے۔ ایک مجلس شوریٰ اور

دوسرا مسلمانوں کا اجتماع عام۔ بالعموم معاملات مجلس شوریٰ ہی میں طے ہوتے تھے لیکن اگر کسی مسئلے پر بڑی مشاورت کی ضرورت محسوس ہوتی تو عام منادی کر دی جاتی اور مسجد میں جمع ہو کر بحث و تمحیص کے بعد اس مسئلے کو جمعیت مسلمین طے کر لیتی۔

یہ بحث و مشورہ پوری طرح آزادانہ فضا میں ہوتا اور ہر شخص اپنی حقیقی رائے کا بے لاگ اظہار کرتا۔ ایک مجلس مشاورت کی افتتاحی تقریر میں حضرت عمرؓ نے صحیح اسلامی پالیسی کو اس طرح بیان فرمایا: ”میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ لوگ وہ ہیں جو حق کا اقرار کرتے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔“

مولانا شبلی نعمانی نے المفاروق میں اس نظام مشاورت کی پوری تفصیل دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام، شوریٰ کی بنیاد پر قائم تھا۔

د- قانون سازی کا اختیار امیر کو حاصل نہیں تھا۔ اصل قانون قرآن اور سنت ہے لیکن جن چیزوں میں قرآن و سنت خاموش ہیں، امیر کا اجتہاد بھی ایک اجتہاد ہے۔ قانون کا درجہ اسے صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس پر اُمت کے ارباب حل و عقد کا اجماع ہو جائے۔ قانون ساز ادارے (Legislative Organ) کی حیثیت اجماع کو حاصل ہے، امیر کی رائے کو نہیں۔ اپنے زمانے میں یہ ایک ایسا انقلابی اقدام تھا کہ ایک عرصے تک تاریخ اس کی اصل اہمیت کو محسوس بھی نہ کر سکی۔ آج جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل وظائف حکومت کی مختلف اداروں میں تقسیم تھی اور اس کے ذریعے نظام حکومت میں محاسبہ و توازن کا ایک نظام قائم کیا گیا تھا۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خلافت راشدہ کی دوسری بنیاد شوریٰ تھی یہی اسلام کی اصل روح ہے۔ اگر یہ باقی نہ رہے تو پھر خلافت کا نظام بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے خلفائے اربعہ کے زمانے میں مناسب ادارے بھی بنائے گئے تھے تاکہ شوریٰ کا اصول عملی طور پر بروئے کار آسکے۔ جب خلافت آمریت اور ملوکیت میں بدل گئی تو شوریٰ کا یہ نظام بھی درہم برہم



ہو گیا۔ اسلام کے اس شورائی نظام کو اسلامی جمہوریت کہا جاسکتا ہے جس میں جمہور کی رائے اور کردار ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طے کردہ حدود کے اندر واقع ہوتا ہے اور ان حدود سے باہر جانے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں۔

### ریاست کا فلاحی تصور

خلافتِ راشدہ کی تیسری بنیاد ریاست کا فلاحی تصور تھا۔ ریاست محض ایک منفی ادارہ نہیں ہے جو محض اندرونی خلفشار اور بیرونی حملہ سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہو، بلکہ معاشری تنظیم کی وہ صورت ہے جس کے ذریعے مثبت طور پر ایک خاص طرز زندگی کو ترویج دینے کی منظم سعی و جہد کی جائے۔ اس ادارے کا اصل مقصد نیکی کا فروغ، بدی کا استیصال اور ایک فلاحی معاشرے کا قیام ہے جو انسانوں کی حقیقی ضرورتوں کا اہتمام کرے، اور ان کو مادی اور اخلاقی اعتبار سے اس لائق بنادے کہ وہ زمین پر اللہ کے خلیفہ کا کردار موثر انداز میں ادا کر سکیں۔

خلافتِ راشدہ کا مقصد اجتماعی فلاح کا قیام تھا اور اس سلسلے میں خلافتِ راشدہ نے تین بنیادی اقدامات کیے:

۱- پہلا اقدام کتاب و سنت کی تعلیم، اور ان کا فروغ اور قیام تھا۔ حضور اکرمؐ نے جب عمرو بن حزمؓ کو یمن کا گورنر بنایا تو ان کو ہدایت کی تھی کہ وہ حق پر قائم رہیں، جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور نیکی کا حکم دیں اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کریں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہو جائیں۔ اسی پالیسی پر خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں عمل کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا:

”اے اللہ! میں اپنے تمام علاقوں کے عہدے داروں پر تجھ کو گواہ ٹھیراتا ہوں کہ میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین اور ان کے نبیؐ کی سنت کی تعلیم دیں۔“

ایک دوسرے خطبے میں آپؐ نے فرمایا: ”میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ تم کو تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دیں۔“

خلفائے اربعہ قیامِ فلاح کے لیے سب سے ضروری اس امر کو سمجھتے تھے کہ لوگوں کو فلاح کا صحیح اور اس کا اصل راستہ بتادیں اور یہ علم قرآن اور سنتِ نبویؐ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کا

مقصد دنیاوی اور اخروی فلاح تھا اور اس کے حصول کے لیے سب سے پہلی ضرورت قرآن اور سنت کی تعلیم اور تفسیر تھی۔

۲- دوسری بنیادی چیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یعنی ریاست تمام اچھی چیزوں کی ترویج کرے، نیکیوں کو پھیلانے، صدقات کو عام کرے اور خیر کی روایت قائم کرے، نیز ان تمام چیزوں کی حوصلہ افزائی کرے جو کسی طرح بھی حسنت کو فروغ دینے والی ہوں۔ اسی طرح ریاست ان تمام چیزوں کو ختم کرے جو بُرائی اور منکر کو پھیلانے والی ہوں اور معاشرے میں کسی قسم کی بھی گندگیوں کو نہ پھیلنے دے تاکہ فرد اور ملت دونوں کو صحیح خطوط پر ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔ حکومت کی اس پالیسی کی اساس قرآن کا یہ حکم ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَامِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُوْمِنُونَ بِاللّٰهِ (ال عمران ۱۱۰:۳) ”تم وہ بہترین اُمت ہو جو انسانیت کی طرف بھیجے گئے ہو، پس نیکیوں کا حکم کرو، برائیوں کو روکو، اور تم مومن ہو“۔

۳- اس سلسلے کی تیسری چیز یہ ہے کہ حکومت عوام کے لیے آسانیاں پیدا کرے، ان پر ظلم و جبر نہ کرے، ان پر ایسا بوجھ نہ ڈالے جس کے وہ متحمل نہ ہو سکتے ہوں۔ نیز حسنت زندگی کو فروغ دے، اور اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے دائرہ اثر میں کوئی تنفس بلا لحاظ مذہب و ملت ایسا نہ رہے جو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری نہ کر رہا ہو۔

حضرت عمرؓ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ مجاہدین زیادہ عرصے تک اپنے اہل و عیال سے جدا نہ رہیں، اور کہا کرتے تھے کہ ”اور تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمہیں تباہی میں نہ ڈالوں اور تم کو سرحدوں میں روکے نہ رکھوں“۔

اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو ایک خط میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ ”سب سے زیادہ خوش نصیب حاکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا خوش حال ہو، اور سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا بد حال ہو۔ تم خود بھی اپنے آپ کو کج روی سے بچانا تاکہ تمہارے ماتحت کج روی اختیار نہ کریں“۔

اس حقیقت کو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا تھا کہ: ”اے اللہ! جو شخص میری اُمت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ ان کو مشقت میں ڈالے تو، تو بھی

اس کو مشقت میں ڈال۔ اور جو شخص میری اُمت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا تو، تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔“

خلافتِ راشدہ کی تمام پالیسیوں میں لوگوں تک حسنت زندگی پہنچانے اور ضرورت مندوں کی کفالت کرنے کا جذبہ کارفرما تھا، بلکہ حضرت عمرؓ تو فرمایا کرتے تھے کہ: ”خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو صفاء کے پہاڑوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چرا رہا ہوگا، اس کو بھی اس مال سے اس کا حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔“ اور یہ کہ: ”خدا کی قسم! اگر میں اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امیر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔“

خلافتِ راشدہ ایک صحیح اور معیاری خادم خلق ریاست تھی اور عوام کی حقیقی فلاح و بہبود اور ان کے لیے آسانوں کی فراہمی اس کا اصل مقصد تھا اور حکومت کا یہی فلاحی تصور خلافتِ راشدہ کی تیسری بنیادی خصوصیت تھا۔

### حقوق اور آزادیوں کا تحفظ

خلافتِ راشدہ کی چوتھی بنیاد تمام شہریوں کے حقوق کا تحفظ اور ان کی شخصی اور سیاسی آزادی کی ضمانت تھی۔ حضرت عمرؓ نے حقوق کی ضمانت ان الفاظ میں دی تھی کہ: ”میں کسی شخص کو اس بات کا موقع نہیں دوں گا کہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی پر زیادتی کر سکے۔ جو شخص ایسا کرے گا میں اس کا ایک گال زمین پر رکھوں گا اور اس کے دوسرے گال پر اپنا پاؤں رکھوں گا یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھک جائے۔“

حضرت ابو بکرؓ نے شہریوں کے حقوق کی حفاظت کا اعلان اس بلیغ انداز میں فرمایا تھا کہ: ”تمہارے اندر جو بے اثر ہے، وہ میرے نزدیک بااثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے چھینا ہوا حق اس کو واپس دلا دوں۔ اور تمہارے اندر جو بااثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے اس حق کو وصول کر لوں جو اس نے غصب کر رکھا ہے۔“ حقیقت یہ ہے کہ خلفائے اربعہ نے یہ کام کر کے دکھا دیا۔ جب بھی کسی عامل نے کوئی زیادتی کی، انھوں نے فوراً اس پر مواخذہ کیا اور اس کا تدارک کیا۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد تھا کہ: ”میں اپنے عاملوں کو تمہارے پاس اس لیے نہیں بھیجتا کہ وہ تمہیں ماریں پیئیں یا تمہارے مالوں کو ناجائز طریقے پر لیں، بلکہ اس لیے بھیجتا ہوں کہ تم کو تمہارا دین سکھائیں اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ اگر کسی کے ساتھ اس قسم کی کوئی زیادتی کی گئی ہو تو وہ میرے علم میں لائے۔ اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں اس کو زیادتی کرنے والے سے اس کا قصاص ضرور دلاؤں گا۔“

اس نظام میں لوگوں کی آزادیوں کا جو لحاظ رکھا جاتا تھا وہ حضرت عمرؓ کے ان تاریخی الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے والی مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔“

آپ نے اس بات کی بھی ضمانت دی کہ کسی کو عدل اور قانون کے تقاضے پورے کیے بغیر اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا:

وَاللّٰهِ لَا يُؤَسِّرُ رَجُلٌ فِي الْاِسْلَامِ بِغَيْرِ عَدَلٍ، خدایا کی قسم! اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جاسکتا۔

حد یہ ہے کہ اس نظام میں اس شخص تک کو آزادی حاصل ہوتی تھی اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جاتی تھی جو خواہ نظری طور پر حکومت کا باغی ہی کیوں نہ ہو مگر عملاً بغاوت نہ کر رہا ہو۔ حضرت علیؓ نے خوارج کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ: ”تم کو آزادی حاصل ہے کہ جہاں چاہو رہو، البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے، بد امنی نہیں پھیلاؤ گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔“

اس سے وسیع تر آزادی کا کون سا تصور ہے جو انسان کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کی بڑی اہم خصوصیت اس کا وہ نظام تھا جس میں آزادی اور حقوق انسانی کی کُلّی ضمانت تھی..... اور یہ محض ضمانت نہ تھی بلکہ اس ضمانت کے ایک ایک حرف پر پوری راست بازی کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔

## تنقید و محاسبہ

خلافتِ راشدہ کی پانچویں بنیاد اس کا نظامِ تنقید و محاسبہ تھا۔ دنیا کے دوسرے نظام ہائے سیاست میں تنقید کو ایک حق مانا گیا ہے اور سیاسیات کے طالب علم اس امر سے اس طرح واقف ہیں کہ کتنی جدوجہد، کتنی قربانیوں اور کتنی کشمکش کے بعد عوام کا یہ حق دنیاے تہذیب میں تسلیم کیا گیا ہے، لیکن خلافتِ راشدہ کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں پہلے دن سے تنقید و محاسبے کی فضا قائم تھی۔ ہر شخص نظامِ حکومت پر نگاہ رکھتا تھا، اور جہاں کہیں بھی جو بُرائی دیکھتا تھا، اس کو درست کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا تھا، بلکہ گہری نگاہ سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ اور خود آج کے جمہوری نظام میں تنقید و محاسبے کے مقام کے سلسلے میں ایک بڑا باریک لیکن بڑا اہم فرق تھا۔ دوسرے نظاموں میں تنقید زیادہ سے زیادہ عوام کا ایک حق رہی ہے لیکن خلافتِ راشدہ میں یہ صرف حق ہی نہیں بلکہ ایک فریضہ بھی تھی۔ یہ بات لوگوں کی مرضی پر چھوڑ نہیں دی گئی تھی کہ چاہے محاسبہ کریں اور چاہے نہ کریں، بلکہ ان کو یہ تربیت دی گئی تھی کہ دین کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان صحیح طریقے پر تنقید و محاسبہ کرتا رہے اور اگر کوئی شخص اپنے اس فریضے کو ادا نہیں کرتا تو وہ اس کو تباہی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوگا۔

تنقید و محاسبے کی بنیاد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات میں ہے:

الدِّينُ النَّصِيحَةُ لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِإِئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ، دین نام ہے خیر خواہی کا، خیر خواہی اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے قائدین کی اور سب مسلمانوں کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو“۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ”اگر برائی کو دیکھو تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دو، اگر اس کی استطاعت نہ رکھتے ہو تو زبان سے اس کے خلاف آواز بلند کرو، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل میں اس کو بُرا جانو، اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے“۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ”اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث اس وقت تک

عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب نہ پیدا ہو جائے کہ اپنے سامنے بُرے اعمال ہوتے دیکھیں اور انھیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔“

خلافتِ راشدہ کے نظام کی بنیاد زبانِ رسالت مآب سے نکلی ہوئی انھی ہدایات پر تھی۔ اس نظام میں معاشرے کا ضمیر بیدار تھا اور فضا صحت مند تقید اور مخلصانہ محاسبے سے معمور تھی اور یہ مقدس ذمہ داری ایک طرف کسی مہابنت کے بغیر انجام دی جاتی تھی تو دوسری طرف اس کو ان حدود میں رکھا جاتا تھا جو بدظمی، انتشار، افتراق اور انارکی کے فساد سے معاشرے اور ریاست کو محفوظ رکھیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد جو تاریخی خطبہ دیا اور اس حالت میں ارشاد فرمایا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے: ”اے لوگو! میں اس جگہ اس لیے مقرر نہیں کیا گیا ہوں کہ تم سے برتر بن کے رہوں۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ کوئی اور اس جگہ کو سنبھالتا، میں تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ جب تم دیکھو کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں تو میری پیروی کرو۔ اور اگر دیکھو کہ میں راستی سے ہٹ گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔“

حضرت عمرؓ نے خلافت کا بار اٹھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ”اے لوگو! تم نفس کے مقابلے میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ بھلائی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو۔ نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے اس کے بارے میں میری خیر خواہی اور مجھے نصیحت کرتے رہو۔“

دورِ خلافتِ راشدہ میں امیر المؤمنین ہر جمعہ کو پبلک سے خطاب کرتا تھا۔ جمعہ کے خطبے میں اپنی پالیسی بیان کرتا تھا۔ اپنے کو خود پبلک کے سامنے پیش کرتا تھا اور پبلک کو پورا پورا موقع دیتا تھا کہ وہ اس پر تنقید کرے، اس سے اختلاف کرے، اس کے سامنے شکایت پیش کرے۔ مختصراً یہ کہ وہ اپنی پالیسی پر عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں خطبہ جمعہ دینی عبادت کے ساتھ ایک سیاسی ادارہ تھا اور اس کی حیثیت بحث و مباحثے اور افہام و تفہیم کے ایک پلیٹ فارم کی بھی تھی۔

حضرت عمرؓ کے مزاج کی سختی کے متعلق تو ہر شخص بہت کچھ جانتا ہے لیکن دورِ خلافتِ راشدہ کے طالب علم کی نگاہ سے یہ بات اوجھل نہیں کہ سب کو آپ تنقید و محاسبے کی دعوت دیتے اور اسے

صبر و سکون سے برداشت کرتے بلکہ اس تنقید سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں بھی ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ انھوں نے کبھی بھی لوگوں کو اس حق سے کسی درجے میں بھی محروم کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جو پوزیشن انھوں نے اختیار کی وہ ایک ایسی اعلیٰ مثال ہے جو انسانوں کے لیے ہمیشہ روشنی کا مینار رہے گی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد سے نکلے، چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک خاتون (خولہ بنت حکیم) دوسری طرف سے آئیں۔ آپ نے ان کو سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا اور فوراً برس پڑیں: ”عمرؓ! تمہارے حال پر افسوس ہے، میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے کہ تم عمیر عمیر کہلاتے تھے اور لٹھیا لیے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا جب تم عمر کہلانے لگے اور اب یہ زمانہ ہے کہ میں دیکھ رہی ہوں کہ امیر المؤمنین بنے پھر رہے ہو۔ رعایا کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ آخرت کے عالم کو بالکل اپنے آپ سے قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہوگا وہ ہمیشہ اس فکر میں رہے گا کہ خدا کی دی ہوئی فرصت رائیگاں نہ ہونے پائے۔“ حضرت عمرؓ نے ان کی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور جن صحابہ نے ان کی سختی کی شکایت کی، ان کو خاموش کر دیا۔

اسی طرح ایک اور شخص نے حضرت عمرؓ کو سختی سے ٹوکا اور آپ سے کہا: ”اے عمر! اللہ سے ڈر! اللہ سے ڈر! (اور اس جملہ کو تین بار کہا)، ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اب بس بھی کرو، بہت ہو چکا تو حضرت عمرؓ نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے: ”ان کو کہنے دو، اگر یہ ہم کو یہ باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں، اور اگر ہم ان کی ان نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں۔“

خدا کی قسم! یہ الفاظ انسانی آزادی اور حق تنقید و محاسبے کا سب سے بڑا چارٹر ہیں، اور خلافت راشدہ کا نظام اس تنقید و محاسبے کی بنیاد پر قائم تھا۔ اسی کی وجہ سے حکومتِ راہِ حق پر قائم رہتی تھی اور ہر کجی سے محفوظ رہتی تھی۔ استحکام اور ترقی کے لیے اس سے بڑی ضمانت اور کون سی ہو سکتی ہے؟

پارٹیاں اور پارٹی پرستی

خلافت راشدہ کی ایک اور بنیادی خصوصیت پارٹی پرستی سے کامل احتراز تھا۔ سیاسیات کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ معاملات کی انجام دہی میں نمائندگی (representation) کی

ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں بلا واسطہ رابطہ قائم کرنا ممکن نہ ہو۔ یونان کی شہری حکومت میں کسی نمائندہ اسمبلی کا وجود نہ تھا۔ اس لیے کہ وہاں پوری شہری آبادی ایک اسمبلی کی حیثیت رکھتی تھی اور جب بھی حکومت کو مشورے کی ضرورت پیش آتی تمام لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اسی اجتماع میں فیصلہ کر لیا جاتا۔ جب ہیئتِ اجتماعی وسیع ہوا تو بلا واسطہ جمہوریت کے مقابلے میں نمائندہ جمہوریت کا ظہور ہوا۔ اور اس نمائندگی کے نظام میں نمائندوں کو شہریوں کی رائے اور ان کی مرضیات کا حقیقی نمائندہ بنانے کے لیے سیاسی پارٹیوں کا نظام وضع کیا گیا۔ اس لیے کہ اگر عوام کے نمائندوں کو ان کے نظریات کا نمائندہ ہونا چاہیے تو ضروری ہے کہ پروگرام اور پارٹی کی ذمہ داری کا نظام موجود ہو۔ اس پارٹی کے نظام نے جہاں بہت سی حقیقی ضرورتوں کو پورا کیا، نیز جہاں وسیع و عریض ممالک اور لاکھوں اور کروڑوں کی آبادی میں اس کا قیام ناگزیر ہو گیا، وہیں اس میں ایک بڑی خرابی بھی رونما ہوئی اور وہ پارٹی پرستی، یعنی پارٹی کو حق و باطل کا معیار جان لینا، اصول اور اقدار کی بالادستی سے صرف نظر اور اپنے ضمیر کی آواز کے مقابلے میں محض پارٹی کی موافقت کے جذبات سے کام کرنا۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں ہمیں یہ اہم چیز نظر آتی ہے کہ اس میں اپنے دور کے قبائل، برادر یوں اور مشترک اجتماعی وجود رکھنے والے گروہوں کو ختم نہیں کیا گیا لیکن پارٹی بازی اور خاندانی، قبائلی یا گروہی مفادات کو حق و باطل کا معیار ماننے کا اصول بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ گروہ اور احزاب اس لیے تھیں کہ لوگ ایک دوسرے کو جانیں، اجتماعی نظام زیادہ آسانی سے کام کر سکے۔ ہر شخص کی رائے معلوم کرنے کے بجائے ایک گروہ اور پارٹی کے قائدین کی رائے معلوم کر لی جائے اور اس طرح اس پورے گروہ کے نقطہ نظر سے آگاہی حاصل کر لی جائے لیکن تربیت اور تعلیم کے ذریعے سے لوگوں میں پارٹی کی عصبيت کو، پارٹی بازی اور پارٹی پرستی کو ختم کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ راشدہ نے کسی جبر و تشدد کے بغیر، غلط احساسات کو زیادہ سے زیادہ دبا دیا، اور پارٹی پرستی کے فتنے کو اخلاقی سنوار کے ذریعے ختم کر دیا۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں سب سے پہلے تو مہاجرین اور انصار کے دو گروہ تھے اور ان کے سربراہ اپنی پارٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے امورِ سلطنت میں تعاون کرتے تھے۔ پھر خود انصار کے دو اہم قبیلے اوس اور خزرج کی شکل رکھتے تھے اور جس شخص نے بھی تھقیفہ بنو ساعدہ کی بھٹوں کا



مطالعہ کیا ہے وہ ان کے سیاسی وجود اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح مہاجرین میں کم از کم تین نمایاں پارٹیاں نظر آتی ہیں۔ بنو امیہ، بنو ہرہ اور بنو ہاشم۔<sup>۱</sup>  
حضرت ابوبکرؓ نے تھیفہ بنو ساعدہ میں اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ امیر مہاجرین میں سے ہوگا اور انصار ان کے وزیر ہوں گے۔ خلفائے اربعہ نے مناصب کی تقسیم کے سلسلے میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ مختلف گروہوں میں سے اہل لوگوں کو مناصب دیے جائیں اور اس طرح ہر پارٹی کو نمائندگی ملتی رہے اور شکر رنجی نہ پیدا ہو۔

حضرت عمرؓ نے پارٹیوں کو ختم نہیں کیا، صرف پارٹی پرستی سے لوگوں کو منع کیا۔ ان کا ارشاد ہے کہ ”اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا وہ شخص جو حق کے معاملے میں اپنی پارٹی کی ناانصافیوں کو گوارا کرنے والا ہو۔ ولا یکظم فی الحق علیٰ مخربہ، یہاں ضربِ حزب کے وجود پر نہیں پارٹی کی ایسی پرستش پر ہے کہ حق و ناحق کا اختیار ہی ختم ہو جائے، اور غالباً یہی خود قرآن پاک کے اس ارشاد کا بھی منشا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ  
لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۳۹)، لوگو! ہم نے  
تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ

۱- مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب اسلامی ریاست، شہریت کے حقوق و فرائض (۴) میں تحریر فرماتے ہیں: انصار اور مہاجرین کی ان دو پارٹیوں کے علاوہ خود مہاجرین کے اندر تین نمایاں پارٹیاں موجود تھیں۔ ● بنو امیہ کی پارٹی عثمان غنیؓ کی قیادت میں، ● بنو ہرہ کی پارٹی سعد اور عبدالرحمن بن عوفؓ کی سرکردگی میں، ● بنو ہاشم کی پارٹی حضرت علیؓ اور عباسؓ ابن عبدالمطلب کی رہنمائی میں۔ اور ان میں سے بعض کا اختلاف حکومت کے ساتھ کھلا ہوا تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت نے انتہائی رواداری کے ساتھ اس اختلاف کو انگیز کیا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر کئی مہینے تک بیعت نہیں کی۔ (ص ۳۲)

۲- خود خوارج کے سلسلے میں جو پالیسی حضرت علیؓ نے اختیار فرمائی وہ بھی اسی مسلک پر روشنی ڈالتی ہے۔ خوارج کی حیثیت ایک متشدد حزب اختلاف کی تھی مگر آپؓ نے ان کو تحریر فرمایا کہ جب تک تم بدامنی نہیں پھیلاتے اور کشت و خون نہیں کرتے ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے اور تمہیں اجازت ہوگی کہ جہاں چاہے رہو۔

ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ نیکو کار اور پرہیزگار ہے۔

یہاں نہ صرف یہ کہ 'شعوب' اور 'قبائل' کے وجود کو ختم کرنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں بلکہ اس کی ایک اہم ضرورت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔ یعنی لتعارفوا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، امتیازات کو محسوس کر سکو، لیکن ساتھ ہی قبائل پرستی، گروہ پرستی اور قوم پرستی کی جڑ یہ کہہ کر کاٹ ڈالی گئی ہے کہ لتعارفوا کی حد سے آگے نہ بڑھنا کیوں کہ اسلام کی نگاہ میں حق اور شرف کا معیار قوم، قبیلہ اور گروہ نہیں ہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

یہی اصول پارٹیوں کے سلسلے میں خلافت راشدہ نے اختیار کیا، یعنی پارٹیوں کے وجود کو ختم نہیں کیا گیا صرف پارٹی پرستی کو ختم کیا گیا۔ حق کا معیار سب کے لیے قرآن اور سنت نبوی قرار پایا اور ہر ایک نے اسی سے استدلال کیا۔ باقی نقطہ نظر اور دوسرے اختلافات کی پہچان کے لیے پارٹیاں موجود رہیں اور نظام خلافت کو صحت مند بنیادوں پر ترقی دینے میں مدد و معاون ثابت ہوتی رہیں۔

### معیارِ قیادت

خلافت راشدہ کی آخری خصوصیت امیر کا ایک خاص کردار ہے جسے اچھی طرح سمجھے بغیر اس دور کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کا امیر ان کا بہترین شخص ہوتا تھا۔ فہم و تدبیر، اور تقویٰ اور صلاحیت کار میں سب پر فوقیت رکھتا تھا اور اس کے ہر کام کا محرک خدا کا خوف اور اُمت کی فلاح تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کا کیا عالم تھا۔ اس کا ذکر حضرت علیؓ کی زبان سے سنئے: یہ تقریر حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے آپ کی وفات کے وقت کی تھی: اے ابو بکر! اللہ تم پر رحم کرے، واللہ! تم پہلے آدمی تھے جس نے رسول اللہؐ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا، ایمان و اخلاص میں تمہارا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ خلوص و محبت میں تم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اخلاق و قربانی، ایثار و بزرگی میں تمہارا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت تم نے کی اور رسول اللہؐ کی رفاقت میں جس طرح ثابت قدم رہے اس کا بدلہ اللہ ہی تمہیں دے..... واللہ تم اسلام کے حصن حصین تھے۔ کافروں کے لیے تمہارا وجود انتہائی اذیت بخش تھا۔ تمہاری کوئی دلیل و زور سے خالی نہ ہوتی تھی اور تمہاری بصیرت فہم و کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمہاری سرشت میں کمزوری کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔

تم ایک پہاڑ کی مانند تھے جسے تند و تیز آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ اگرچہ تم جسمانی لحاظ سے کمزور تھے لیکن دینی لحاظ سے جو قوت تم کو حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تم دنیا والوں کی نظروں میں واقعی ایک جلیل القدر انسان تھے اور مومنوں کی نگاہوں میں انتہائی رفیع الشان شخصیت کے مالک، لالچ اور نفسانی خواہشات تمہارے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ ہر کمزور انسان تمہارے نزدیک اس وقت تک قوی تھا اور ہر قوی انسان اس وقت تک کمزور تھا جب تک تم قوی سے کمزور کا حق لے کر نہ دلوادیتے تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تمہارے اجر سے محروم نہ رکھے اور ہمیں تمہارے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے بلکہ ہمارے سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے۔

حضرت ابو بکرؓ میں ذمہ داری کا احساس اتنا تھا کہ گھنٹوں رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش! میں پتھر ہوتا مگر امارت کے اس بار سے آزاد ہوتا۔ شخصی سیرت کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی پر زیادتی نہ کی، کبھی کسی کو دکھ نہ پہنچایا اور حق کی راہ میں کبھی کوئی کمزوری نہ دکھائی۔ خدمتِ خلق کا یہ عالم تھا کہ خلافت سے پہلے محلے کی جن بیواؤں کا سودا لاکر دیتے تھے اور جن کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے خلافت کے بعد بھی اس کام کو اسی طرح جاری رکھا۔ دن کو امورِ خلافت کی دیکھ بھال اور رات کو عبادت کا اہتمام ان کا روزمرہ کا شعار تھا۔ ہمہ وقتی خدمت کے باوجود کوئی معاوضہ لینے پر تیار نہ ہوتے تھے اور بہ مشکل تیار ہوئے تو بھی وفات کے وقت ساری رقم اپنا مکان بیچ کر ادا کر دی۔

یہ تھی خلیفہٴ اول کی سیرت! اسی لیے آپؐ کی وفات پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ: ”اے خلیفہٴ رسول اللہ! تمہاری وفات نے قوم کو سخت مصیبت اور مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے، ہم تو تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تمہارے مرتبے کو کس طرح پاسکتے ہیں؟“

حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ ”اگر آپ اپنے پیش رو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو قمیص میں بیوند لگا لیجیے، تہم اونچی کیجیے، جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیجیے، جرابوں میں بیوند لگا لیجیے، ارمان کم کیجیے اور بھوک سے کم کھائیے۔“

حضرت عمرؓ اس معیار پر سختی سے قائم رہے کہ اس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ حضرت عمرؓ کسی کز و فر کے قائل نہ تھے۔ زمین پر سوتے، پیدل پھرتے، اپنے اونٹ کی تکیل تھام کر خود چلتے اور اپنے غلام کو آرام کرنے کے لیے اونٹ پر بٹھا دیتے۔ اپنے کپڑے خود دھوتے اور

کپڑے اتنے کم تھے کہ ایک مرتبہ مسجد وقت پر اس لیے نہیں آسکے کہ کوئی دوسرا جوڑا نہ تھا اور آپ اپنی قمیص دھو کر سنکھارہے تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ سفر شام کے دوران میں ایک جگہ راستے میں پانی عبور کرنا پڑا تو بے تکلف اُونٹ سے اُترے، چرمی موزے ہاتھ میں لیے اور اُونٹ کی نکیل تھام کر پانی میں گھس گئے۔ فوج کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے لوگ آپ کی اس بات کو دیکھ کر بڑا تعجب کریں گے، تو آپ نے فرمایا: اے ابو عبیدہؓ! کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سب سے زیادہ ذلیل تھے، ہم سب سے زیادہ حقیر تھے اور ہم سے زیادہ کم تعداد کوئی اور قوم دنیا میں نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کے ذریعے عزت دی۔ یاد رکھو! اگر تم اسلام کی بخشی ہوئی عزت کے سوا کوئی اور صورت عزت کی حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ذلیل کر دے گا۔“

تقویٰ کا یہ حال تھا کہ دن بھر عوام کی خدمت میں اور اُمورِ سلطنت کی انجام دہی میں سرگرداں رہتے اور رات بھر عبادت کرتے اور کہتے کہ اگر میں دن کو غافل ہو جاؤں تو اُمت تباہ ہو جائے اور اگر رات کو غافل ہو جاؤں تو میں تباہ ہو جاؤں۔ بیت المال سے بقدر کفالت لیتے اور اگر اپنے بچوں کے پاس بھی کوئی غیر معمولی چیز دیکھ لیتے تو اس کو فوراً بیت المال میں داخل کر دیتے۔ قحط کے زمانے میں خود گوشت اور گے ہوں کھانا ترک کر دیا اور فرمایا کہ جب تک میں خود وہی تکلیف نہ اٹھاؤں جو عوام اٹھا رہے ہیں، مجھے ان کی مصیبت کا صحیح اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیت المال کی چیزوں کی ایسی نگرانی کرتے تھے کہ ایک بہتہ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکتا تھا۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتے تھے اور ایک مرتبہ جب ان کی بیٹی نے اہل و عیال کو آرام پہنچانے کے لیے کہا تو فرمایا کہ اے بیٹی! تو نے اپنی قوم کے ساتھ تو خیر خواہی کی لیکن اپنے باپ کے ساتھ بدخواہی کی ہے۔ میرے اہل و عیال کا حق میری جان اور میرے مال میں ہے لیکن میرے دین اور میری امانت کے اندر انھیں دخل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ایک مرتبہ بیت المال کا ایک اُونٹ کھو گیا تو آپ دھوپ میں مارے مارے پھرے تاکہ اس کو ڈھونڈھ لائیں۔ حضرت علیؓ نے یہ حال دیکھا تو بے ساختہ کہا: فَذُتُّ الْعُلَفَاءَ بَعْدَكَ، ”آپ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔“

حضرت عمرؓ گلیوں میں پھرتے تھے کہ کوئی مستحق حکومت کی مدد سے محروم نہ رہ جائے اور اگر کسی کی مصیبت کا کوئی واقعہ سامنے آتا تو کانپ اٹھتے۔ خود سامان اٹھا کر لاتے، کھانا پکا کر کھلاتے اور کیا کیا کچھ نہ کرتے!

اور اس سب کے بعد بھی آخر عمر میں کہا کرتے تھے کہ اگر برابر سرابر چھوٹ جاؤں، نہ انعام ہی پاؤں اور نہ ہی سزا کا مستحق ٹھہرایا جاؤں تو بڑی بات ہے۔

حضرت عثمانؓ کا حال بھی یہ تھا کہ اپنا مال اور اپنی دولت دین اور اہل دین کی ضرورتوں کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اُمت کی بہبود کی خاطر اپنا آرام تچ دیا تھا، حتیٰ کہ قوم کو فتنے سے بچانے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دی۔

یہی عالم حضرت علیؓ کا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا اور وہ اپنی ہر صلاحیت اور اپنی طاقت کی ہر رتق اُمت کی بہبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور اپنی ذات کے لیے معمولی سے معمولی چیز بھی نہیں لیتے۔

خلفائے راشدینؓ نے اپنی ذاتی سیرت اور خدمت دین و مسلمین کے ذریعے اُمت کا اعتماد حاصل کیا اور اس دور کی جو بھی خوبیاں نظر آتی ہیں ان کے فروغ میں انسانیت کے انہی بہترین نمونوں کا بڑا دخل ہے۔ خلافتِ راشدہ کا مزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دین کے بے لوث خادم اس نظام کو چلائیں جہی وہ کامیاب ہو سکتے ہیں، اور جب یہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتیں برسانے لگتا ہے، اور دنیا خیر و صلاح سے بھر جاتی ہے۔

اُمت مسلمہ نہ انگلستان کا نظام چاہتی ہے نہ روس کا، نہ امریکا کے طریقوں سے اسے دل چسپی ہے نہ فرانس کے۔ بلاشبہ اپنے زمانے اور اپنی ضرورتوں کے مطابق ان کو اختیار ہے کہ سیاسی اور اداراتی دروہست کا اہتمام کریں، لیکن اصول اقدار اور معیار کے باب میں وہ تو خلافتِ راشدہ کے اصولوں کا احیا چاہتی ہے اور ہر اس پیکر کو پسند کرے گی جو ان اصولوں کو ٹھیک ٹھیک قائم کر سکے۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض

ہم تو اسیر ہیں خم زلفِ کمال کے



## ابلاغ دعوت

آربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے،  
 کروڑوں کو کم از کم اس حد تک متاثر ہونا چاہیے کہ وہ  
 اس چیز کو مان لیں جسے ہم لے کر اٹھ رہے ہیں،  
 لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی تائید کے لیے  
 آمادہ ہونا چاہیے، اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی  
 تیار ہو جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصد  
 کے لیے کوئی بھی خطرہ، نقصان، یا مصیبت برداشت  
 کر سکیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی<sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup>

